eISSN: 2789-6331
pISSN:2789-4169

ڈاکٹر خالد محمود
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ انبالہ مسلم گریجویٹ کالج، سرگودھا
ڈاکٹر طیبہ نگہت
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج وویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

Dr. Khalid Mahmood
Assistant Professor, Dept. of Urdu, Government Ambala Muslim Graduate College, Sargodha
Dr. Tayyaba Nighat
Assistant Professor, Dept. of Urdu, Government College Women University, Faisalabad

سانحہ قحط بنگال اور اردو افسانہ

TRAGEDY OF BANGAL FAMINE AND URDU AFSANA

ABSTRACT

As we look into human history we may witness numerous tragic events which have inflicted pain and misery on humanity. These historical tragedies have affected every segment of life, especially the writers. The Tragedy Of the Bangal Famine has immensely effected the writers, Urdu Afsana is of no exception. We can witness numerous short stories (afsany) were written under in the shadow of Bangal Famine and showing human plight. In these short stories (afsany) variegated effects of this tragedy were presented in which human suffering, and economic, social and moral effects are worth mentioning. This period of gloom and grief also got it's presentation in Urdu Afsana. This article is an endeavor to bring forth the effects of Bangal Famine on Urdu Afsana.

KEYWORDS

Historical happenings, Famine, human plight, gloom, worth mentioning

کافی عرصہ تک بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے غذائی اجناس کی پیداوار متاثر ہو جاتی ہے اس بنا پر خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قحط غذائی قلت پر محیط ایسی صورت حال ہے جس میں کسی بھی جاندار کو خوردنی اشیا دستیاب نہ ہوں یا اشیائے خوردنی کی شدید کمی ہو جائے، جو عموماً زمینی خرابی، خشک سالی اور وبائی امراض کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت حال میں بڑے پیمانے پر اموات کا خدشہ ہوتا ہے۔ 1943 میں صوبہ بنگال میں شدید قحط آیا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اس میں تقریباً بیس سے تیس لاکھ کے درمیان افراد کی اموات ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ قحط بنگال کی واحد وجہ خراب فصل نہیں تھی بلکہ اس کی ایک اور اہم وجہ انگریز سامراج تھا کیونکہ برطانوی راج اپنا سارا غلہ

دوسرے ممالک میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اپنی برسرپیکار فوجوں کو بھیج رہا تھا جس کی وجہ سے غلے کی قلت ہو گئی۔ تاج برطانیہ کو یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں جاپانی برما کی طرف سے ہندوستان میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس لیے انہوں نے بنگال کا سارا اناج برآمد کر دیا، تاکہ جاپانی فوج کو غلہ میسر نہ آ سکے۔ برطانوی سامراج نے برصغیر کے لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے بطور چارہ استعمال کیا اور انہیں اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھایا۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم ونسٹنٹ چرچل کا ایک بیان سامنے آیا جو انہوں نے قحط کی صورت حال میں دیا جس سے سارے معاملے میں ان کی غیر سنجیدگی اور بدنیتی کا اندازہ ہوتا ہے:

> مجھے ہندوستانیوں سے نفرت ہے۔ یہ جنگلی لوگ ہیں اور ان کا مذہب بھی جنگلی ہے۔ قحط ان کی اپنی غلطی ہے کیونکہ وہ خرگوشوں کی طرح آبادی بڑھاتے ہیں۔(1)

برطانوی سامراج نے اتنی کثیر تعداد میں ہلاک ہونے والی آبادی کی دیکھ بھال کا کوئی خاص انتظام نہ کیا۔ اس طرح بنگال میں آئے روز اموات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یہ تعداد تیس لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔

اس ضمن میں ڈاکٹر انوار احمد تحریر کرتے ہیں:

> 1943-44 کا قحط بنگال بھی قدرت کی بجائے انہی بدیسی آقاؤں اور ان کے مقامی کارندوں کی لوٹ کھسوٹ اور سازش نے مسلط کیا تھا۔ چاول کے محض ایک دانے کو ترستی ماؤں نے اولاد کو شاید اسی لیے بھی بیچا کہ وہ ان کی طرح بھوک کی دوزخ میں نہ جلے۔ اس آگ میں عورتوں نے اپنی عصمت اور مردوں نے اپنی غیرت جھونکی مگر بنگال کی سرزمین پر بھوک کا شعلہ فشاں رقص بہت دیر تک جاری رہا۔ اس سرزمین پر جسے فطرت نے زرخیز اور محنت کشوں نے بارآور بنایا تھا مگر لوٹ مار کے نظام کے روبرو بھوک اور اذیت کے صحرا میں بدل گئی۔(2)

برطانوی حکومت کی بدنیتی اور بدانتظامی اس سانحہ کی وجہ بنی۔ جس کے تحت لاکھوں لوگوں کی زندگیاں متاثر ہوئیں۔ قحط سے اموات کے علاوہ کئی بنگالی لڑکیوں کو بھوک کے مارے بیچ دیا گیا کئی مرد بے غیرتی کی زندگی گزارنے لگے۔ قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے تناظر میں اردو افسانے بھی تحریر کیے گئے۔ اس موضوع پر افسانے تحریر کرنے والوں میں کرشن چندر، ابراہیم جلیس، دیوندر ستیارتھی، صدیقہ بیگم، قدرت اللہ شہاب، اختر اورنیوی اور میرزا ادیب جیسے افسانہ نگار نمایاں ہیں۔

کرشن چندر کا افسانہ ''ان داتا'' قحط بنگال پر لکھے جانے والے انسانوں میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں قحط بنگال کے انسانی المیے کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> اسی طرح جب 1943 کے قحط بنگال میں پندرہ لاکھ انسان بھوک سے مر گئے۔ ہزاروں لڑکیاں پانچ سیر موٹے اور ٹوٹے چاول کے عوض ماں باپ نے خوشحال گھرانوں میں بیچ دیں تو بنگال کا یہ قحط کرشن کے سینے میں خنجر کی طرح اتر گیا۔ انہوں نے ''ان داتا'' لکھی۔ (3)

افسانہ ''ان داتا'' ایک خاص ہیت اور جدت طرازی کے انداز میں تحریر کیا گیا۔ شروع میں ایک غیر ملکی قونصلیٹ کے مکتوبات ہیں جو وہ کلکتہ سے اپنے افسر اعلی کو لکھتا ہے۔ اسلوب ایسا ہے اور حقائق کو اس طرح مسخ کیا گیا ہے کہ کوئی بھی قاری انہیں پڑھ کر انگریز سامراج کی سفاکیت پر کھول اٹھتا ہے۔ ''ان داتا'' میں کرشن چندر نے اس عہد کے بنگال کے تلخ حقائق کو پیش کیا ہے۔ حقائق اور معاصر تاریخ کی پیش کش کرشن چندر کے ہاں مہارت سے ملتی ہے۔

اس حوالے سے شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> کرشن چندر وہ حساس فنکار تھے، جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کا فوری طور پر اثر قبول کرتے تھے اور اس کا فوری اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم ہو یا بنگال کا قحط۔ بمبئی میں جہازیوں کی بغاوت ہو یا آزادی ہند کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات یا تلنگانہ کے کسانوں کی بغاوت شاید ہی کوئی ایسا اہم عصری واقعہ ہو جس کے بارے میں کرشن چندر نے افسانے نہ لکھے ہوں۔ (4)

پورا بنگال قحط کی لپیٹ میں آ چکا تھا، لاکھوں لوگ قحط کی نذر ہو چکے تھے۔ جو زندہ تھے ان کا برا حال تھا، وہ بھوک سے بلک رہے تھے ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ تاجر اس نادر موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں مصروف تھے۔ وہ گھروں، تہ خانوں اور گوداموں میں غلے کی ذخیرہ اندوزی کر رہے تھے اور خریداروں سے منہ مانگی قیمت وصول کر رہے تھے۔ ذخیرہ اندوز دولت اکٹھی کرنے اور عیش میں مگن تھے، جبکہ غریب لوگ اپنی بہنوں، بیٹیوں کو بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لوگ شہروں سے دیہاتوں اور دیہاتوں سے شہروں کی جانب نقل مکانی کر رہے تھے لیکن کہیں بھی ان کا معاملہ درست نہیں ہو پاتا تھا اور انہیں ہر جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ 1943 میں بحرانی کیفیت تھی جنگ عظیم جاری تھی اور برصغیر میں بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ آزادی کی تحریکیں الگ سے جاری تھیں۔ کرشن چندر نے اس افسانے میں ان حالات کی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔

ان داتا'' کا پہلا باب ''وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے'' خطوط کی شکل میں انگلستان کے قونصلیٹ کا سفیر حکام بالا کو بنگال کے حالات کے بارے میں لکھتا ہے۔ وہ ان خطوط میں انہیں قحط بنگال سے پیدا شدہ حالات کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔ ایک خط میں وہ

میئر کلکتہ کا ذکر کرتا ہے جس سے برطانوی سامراج کی قحط کے معاملے میں سرد مہری بالکل آشکارا ہو جاتی ہے:

> میئر آف کلکتہ کا خیال ہے کہ بنگال میں شدید قحط ہے اور حالت بے حد خطرناک ہے۔ اس نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اپنی حکومت کو بنگال کی مدد کے لیے آمادہ کروں۔ میں نے اسے اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا، لیکن یہ امر بھی اس پر واضح کر دیا کہ یہ قحط ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور ہماری حکومت کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی۔ ہم سچے جمہوریت پسند ہیں۔ (5)

بنگال میں قحط سے حالات بدترین ہوتے جا رہے تھے۔ جب قونصل کا ملازم اپنی چھوٹی بہن اور ڈرائیور کے ساتھ بہن کے لیے گڑیا خریدنے نکلتا ہے تو واپسی پر ایک بنگالی عورت انہیں ملتی ہے جو اپنی بچی کو بیچنا چاہتی ہے۔ یہ واقعہ بنگال میں اس وقت درپیش صورت حال کو پیش کرتا ہے جو سارے حالات کی قلعی کھول دیتا ہے:

> پھر بنگالی عورت نے تیزی سے کچھ کہا۔ بنگالی ڈرائیور نے اسے سرعت سے جواب دیا۔ کیا کہتی ہے یہ'' میں نے پوچھا۔ ڈرائیور نے اس عورت کی ہتھیلی پر چند سکے رکھے اور کار آگے بڑھا لی۔ کار چلاتے چلاتے بولا، ''حضور یہ اپنی بچی بیچنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ روپے میں'' ڈیڑھ روپے میں۔ یعنی نصف ڈالر میں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''ارے نصف ڈالر میں تو چینی کی گڑیا بھی نہیں آتی۔'''' آج کل نصف ڈالر میں بلکہ اس سے بھی کم قیمت پر ایک بنگالی بچی مل سکتی ہے صاحب!'' میں حیرت سے اپنے ڈرائیور کو تکتا رہ گیا۔ (6)

کرشن چندر نے اس عصری سانحہ کے انسانی المیے کو پیش کیا ہے۔ قحط بنگال نے لوگوں کی زندگی پر معاشی اثرات بھی مرتب کیے وہ انتہائی غربت کی زندگی گزارنے اور اپنی بیٹیاں فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس افسانہ کا دوسرا باب ''وہ آدمی جو مر چکا ہے'' ہے اس باب کا مرکزی کردار ایک عیاش اور آرام طلب نوجوان ہے۔ وہ قحط بنگال سے متاثرہ لوگوں اور مرنے والوں کی تصاویر دیکھتا ہے پل بھر کو اس کے ذہن میں اپنے ان غریب اور المفلوک حال ہم وطنوں کے بارے میں احساس ہمدردی پیدا ہوتا ہے پھر وہ اپنے تعیشات میں لگ جاتا ہے۔ اپنی محبوبہ سنیبہ سے ان کے بارے میں بات کرتا ہے اس دوران سنیبہ کا رویہ اور انداز اشرافیہ کے لوگوں کا سا ہے جو کسی کا درد بھی بڑے ناز و انداز کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اس بارے میں پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

> ان داتا کا نوجوان جس کے دل میں بنگال کے بھوکوں کی مدد کرنے کی بے حد خواہش ہے۔ اس کی انسانیت

> اور اس کے طبقاتی شعور کی پیدا شدہ خود غرضی میں جنگ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل میں اتنا درد محسوس کرتا ہے کہ اپنی ہم رقص کی یادوں میں پر زور لیوشن تک پاس کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے ضمیر میں جو کانٹا ہے وہ کھٹکتا رہتا ہے۔ اگر اسے عمل کا صحیح راستہ مل جائے تو وہ اپنے شعور کے تضاد سے باہر آسکتا ہے۔ لیکن وہ راستہ وہ تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ ایک ایسا راستہ ڈھونڈتا ہے جو اس کے شایان شان ہو۔(7)

ان داتا'' کا تیسرا حصہ ''وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے'' ہے۔ افسانہ کے اس حصے کا مرکزی کردار ایک ستار بجانے والا ہے۔ اس حصے میں قحط بنگال کی شدت کو بیان کیا گیا ہے۔ بہت غربت اور لاچاری کی فضا ہے ہر طرف پریشانی اور بھوک نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ افسانے کے اس حصے میں اس انسانی المیے پر حکومت اور بااثر افراد کی کم ظرفی اور عدم توجہی پر کرشن چندر شدید طنزیہ انداز اختیار کرتے ہیں:

> خدا سے دعا کرو، وہ تمھیں انسان نہ بنائے، چاول کا ایک دانہ بنادے، اس خالق باری کے سامنے گڑگڑاو، منتیں کرو، دعا مانگو، فاقے کرو، چلہ کاٹو، جس طرح ہو سکے کوشش کرو وہ تمیں انسان نہ بنائے۔ چاول کا ایک دانہ بنادے، گو زندگی انسان میں بھی ہے اور چاول کے دانے میں بھی، لیکن جو زندگی چاول کے دانے میں ہے وہ انسان کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔(8)

قحط بنگال کے دوران انسانی المیہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ واقعی انسان چاول کے دانے کے مقابلے میں سستا محسوس ہونے لگا تھا۔ جانی اور مالی بحران زوروں پر تھا۔ قحط بنگال کے دوران معاشی اثرات بہت سخت نوعیت کے تھے۔ چند مفاد پرست، انسان دشمن، لالچی و ہوس پرست، ذخیرہ اندوز قسم کے لوگ جن میں سیٹھ، بنیے اور زمیندار شامل تھے اس انتہائی مصیبت کی گھڑی میں بھی انسانیت کا استحصال کر رہے تھے۔ اس افسانہ میں کرشن چندر نے قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کو اس کے مختلف عناصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس انسانی المیے میں انسان ہی دوسرے انسان کے لیے ضرر رساں ہو چکا تھا جس نے انسانیت سے اعتماد کو متزلزل کر دیا۔

ابراہیم جلیس نے قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ پر افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں ''ریلیف فنڈ''، ''چور''، ''بلیک آؤٹ'' اور ''دلدر'' نمایاں ہیں۔ ان کا افسانہ ''ریلیف فنڈ'' بارش کے موسم سے شروع ہوتا ہے۔ متکلم کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے قحط بنگال کے متاثرین کے لیے چندہ اکٹھا کرتا ہے۔ ایک روز وہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی، وہاں موجود ایک بوڑھی خاتون اور اس کی بیٹی اسے مزید بارش سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے ہمراہ اپنے گھر لے گئیں۔ بوڑھی عورت متکلم کو بتاتی ہے کہ ان کے مالی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ راشن کارڈ والا آتا ہے تو وہ گھورتا زیادہ ہے اور امداد کم دیتا ہے۔ افسانہ میں نقطہ عروج اس وقت آتا ہے جب وہ بوڑھی عورت متکلم سے کہتی ہے:

> بیٹا۔۔۔ اگر تم سے کچھ ہو سکے تو ہماری مدد کر دو۔ وہاں خورشید اس کمرے میں قمیض لیے تمہارا انتظار۔۔۔
> میرے جسم کے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ یہ ماں کہہ رہی ہے۔ خیر کوئی انوکھی بات نہیں، انوکھی بات صرف اتنی ہے کہ میرے جسم پر رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔(9)

قحط بنگال کی وجہ سے بہت سی اچھی بھلی عورتیں بھی دھندے سے لگ چکی تھیں۔ ابراہیم جلیس نے قحط بنگال کے سانحہ کے معاشی اثرات کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے بین السطور ایسے لوگوں پر طنز کیا ہے جو بنگال کے متاثرین کے لیے ریلیف فنڈ تو جمع کر رہے ہیں لیکن اس فنڈ کو متاثرین پر استعمال کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتے ہیں۔

ابراہیم جلیس کا افسانہ ''چور'' بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے حوالے سے ہے۔ قحط کے دنوں میں مارواڑی لڑکے کے پاس ایک بنگالن لڑکی جسم فروشی کی غرض سے لائی جاتی ہے۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے:

> رانی۔۔ تم سچ مچ کی رانی ہو؟ مارواڑی لڑکے نے رانی پر منڈلاتے ہوئے کہا۔ رانی سچ مچ رانی نہیں تھی بلکہ مارواڑی لڑکا نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ وہ تو ایک کنگال کنواری تھی جس کو رانی کا نام دے کر اس کے ماں باپ نے اپنے دیس کی روایتی محبت کا ثبوت دیا تھا۔ بڑی پیاری صورت تھی اس کی مگر بھوک کے مارے اس کے گلنار رخسار پیلے پڑ گئے تھے۔(10)

رانی کے والدین کے ساتھ ساتھ گیارہ بہن بھائی بھی تھے۔ قحط اور مالی مشکلات کی بنا پر اسے جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مارواڑی کے لڑکے کے پاس ہو کر آنے کے بعد رانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے کوئی سانپ سونگھ کر چلا گیا ہے۔ اس کا منگیتر چندر کلکتہ یونیورسٹی کا بے روزگار گریجویٹ تھا۔ رانی اور چندر کی شادی ہو گئی وہ اکثر اس سے کم گھلتی ملتی اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ چندر پورا دن کھاٹ پر پڑا سوتا رہتا سر شام ایک سیٹھ کے پاس نوکری کے لیے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا:

> سیٹھ نے بنگال کے قحط سے فائدہ اٹھا کر خفیہ طور پر بھوکی عورتوں کی تجارت شروع کر دی تھی وہ اس تجارت میں سیٹھ صاحب کا بہ حیثیت ایک کمیشن ایجنٹ معاون تھا۔ اس نے اب تک کوئی تین ساڑھے تین سو کنواری بیاہی، ادھیڑ، کالی، گوری، موٹی، دبلی، خوبصورت، بدصورت، عورتوں کو سیٹھ کے ہاتھ معقول کمیشن پر بیچا تھا۔ کیا رانی کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔(11)

ابراہیم جلیس قحط بنگال کے انسانی المیے کو بیان کرتے ہیں جب قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر لڑکیوں کی فروخت کا کاروبار عروج پر تھا۔ رانی کا شوہر چندر بھی ایک دلال کا کام کرتا تھا۔ وہ بڑے سیٹھ کو لڑکیاں مہیا کرتا تھا وہ انہیں آگے بیچتا تھا۔ رانی ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی

تھی۔ یہ خبر سننے کے بعد چندر لڑکھڑا گیا۔ اسے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ وہاں سے چلا گیا اس کے بعد وہ کافی مہینوں کے لیے دکھائی نہ دیا۔ قحط بنگال اسی طرح زوروں پر تھا۔ ان دنوں میں ہزاروں رانیوں کے بچے پیدا ہوئے اور چندر اندھیرے میں ڈوبتے رہے۔ ایک دن زکریا اسٹریٹ میں سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کو اٹھانے والی بیل گاڑی آئی تو فٹ پاتھ کے کنارے ایک بھکاری عورت کراہ رہی تھی اس کی سوکھی چھاتی کو چوستے چوستے اس کا بچہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔ فٹ پاتھ پر پڑی یہ عورت رانی تھی اور مرنے والا بچہ اس کا تھا لاشیں اٹھانے والا گاڑی بان چندر تھا۔ افسانہ نگار نے اس انسانی المیے کو عروج پر پہنچا دیا۔ افسانے کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:

> گاڑی بان نے جھک کر اس ہڈیوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ اور چندر کی نظر میں عورت کی آنکھوں کے دھنسے ہوئے گڑھوں میں ڈوبتی گئیں۔ ڈوبتی گئیں اور وہ بے اختیار ہو کر گھٹنوں کے بل اس پر گر پڑا۔ اس کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈی کے نیچے دھنسے ہوئے گڑھے میں اپنی تھوتھنی گاڑے ہوئے وہ گڑگڑانے لگا۔ میری رانی۔ میری دلہن۔ میری جان۔ اور بیل گاڑی بان کی آواز سن کر زکریا اسٹریٹ کو بھیانک چیخوں گونجاتے ہوئے انسانی کیڑوں کے ایک اور ڈھیر کی طرف رینگنے لگے۔(12)

یہ افسانہ ایک اندوہناک انسانی المیے پر اختتام پذیر ہوتا ہے جب رانی اور چندر بہت برے حالات میں دوبارہ ملتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو مجرم تصور کرتے ہیں۔

اس افسانے کے بارے میں شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> قحط بنگال کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے ''چور'' کو لیجیے اس میں قحط کے نتیجہ میں انسان کی زندگی میں پیش آنے والے المیہ کو نہایت دلگداز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 43 کے برصغیر کے قحط نے ہماری قومی تاریخ کی طرح ہماری ادبی تاریخ پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور قحط بنگال پر اردو میں کئی لافانی افسانے لکھے گئے ہیں۔(13)

ابراہیم جلیس کا ایک اور افسانہ ''بلیک آؤٹ'' بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار سجاد ہے جو اپنے بھائی کے دیئے گئے خرچے پر اپنی پڑھائی مکمل کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو باور کرواتا ہے کہ اس کی نظر میں عورت کی قیمت سگریٹ کی ایک ڈبیا سے زیادہ نہیں۔ ایک روز سجاد اور اس کا دوست خالد بازار جاتے ہیں تو انہیں چار اور دوست، رضی، جگجیت سنگھ، پرتھوی اور اختر مل جاتے ہیں۔ وہ بازار میں خوش گپیوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس دوران ایک نوجوان بنگالی عورت ایک ننھے کالے کلوٹے انتہائی کمزور بچے کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ وہ چاروں دوست اسے تاجرانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا بھی بھیک مانگ رہا ہے۔ سجاد اس

بوڑھے بنگالی کو اکنی بھیک میں دے دیتا ہے، دوسرے دوست اس کے ایسا کرنے پر احتجاج کرتے ہیں کہ اگر بھیک دینی ہی تھی تو نوجوان بنگالن کو دیتا۔ ابراہیم جلیس نے بنگالیوں کا انسانی المیہ بیان کیا ہے کہ قحط کی وجہ سے ان کے مالی حالات اس قدر کمزور ہوئے کہ بھیک مانگنے تک نوبت آگئی۔ نوجوان بنگالی لڑکیوں کو اپنی جنسی ہوس بجھانے کی غرض سے دیکھا جاتا۔ اسی دوران وہ سارے دوست فلم تان سین دیکھنے کا منصوبہ بناتے ہیں تان سین جو ایک معروف فلم ہے جو دہلی، بمبئی، حیدر آباد میں بیس بیس ہفتوں سے دکھائی جارہی ہے۔ کلکتہ میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی۔ وہ سجاد کو بھی یہ فلم دکھانے کے لیے ساتھ لے کر جانے کی پیش کش کرتے ہیں لیکن وہ انکار کر دیتا ہے وہ قحط کے ان برے حالات میں فلمیں نہیں دیکھنا چاہتا وہ ان حالات کے بارے میں سوچتا ہے:

> واہ رے تضاد کلکتہ میں ہزاروں انسان دم توڑ رہے ہیں اور دوسری طرف یہ عیش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ
> سینکڑوں سال قبل مرے ہوئے تان سین کی یاد میں فلم بنا کر اس فلم کی سلور جوبلی منائی جارہی ہے اور
> ابھی ابھی دم توڑتے ہوئے انسان کا جنازہ تک نہیں اٹھا۔ (14)

ابراہیم جلیس نے ان تخلیق کاروں پر طنز کیا ہے جو اصل حالات و واقعات کا سامنا نہیں کرتے اور محض تخیل کی بنیاد پر دکھ اور رنج کی کیفیت بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس افسانے کے کردار رضی اور خالد ایسا ہی کریں گے۔ افسانہ نگار نے اس عہد کے سماج پر بھی شدید طنز کیا ہے جو لوگ معمولات زندگی بلکہ تعیشات زندگی کو مد نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ فلموں اور تھیٹر سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ ان لوگوں میں احساس بالکل مفقود ہو چکا ہے، وہ سینکڑوں سال قبل مرے ہوئے تان سین کا خیال تو کرتے ہیں لیکن بنگال میں روزانہ مرنے والے لاکھوں لوگوں سے ناواقف ہیں یا پھر واقفیت رکھنے کے باوجود وہ اس درجہ سفاک اور مردہ دل ہو چکے ہیں کہ ان کے معمولات زندگی ذرا بھر بھی نہیں بدلتے۔

ابراہیم جلیس کا ایک اور افسانہ ''دلدر'' بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانہ کا آغاز ہی ایک کربناک منظر نامے سے ہوتا ہے:

> جب تک اس کی نوجوان لڑکی زندہ تھی وہ اس کی عصمت بیچ بیچ کر اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ لیکن جب وہ بھی
> مر گئی تو اس کو بھیک مانگنے کی نوبت آگئی اور سوائے بھیک مانگنے کے اور چارہ ہی کیا تھا؟ اس میں تو چلنے
> پھرنے کی بھی توانائی نہ تھی۔ جذام سے ہاتھ پیر کی انگلیاں گل سڑ گئیں تھیں۔ (15)

اس افسانہ کے مرکزی کردار نے جنگ عظیم میں شرکت کی تھی اور اس خون ریز لڑائی میں اس کا ایک پاؤں ضائع ہو گیا تھا۔ اس طرح اس کا پاؤں اتحادیوں کی فتح کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس نے ایک رومن کیتھولک چرچ کی سیڑھیوں پر پناہ لے لی تھی۔ جہاں چرچ کی ایک سیاہ فام ملازمہ لڑکی اسے روٹی دے جایا کرتی تھی۔ بوڑھے فقیر نے مسلسل اس سے دوسری روٹی پر اصرار کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

> تو نوکرانی ہے؟ تو نوکرانی کیوں ہے؟ تو کب تک نوکرانی رہے گی؟ اری پگلی چپکے سے گر جا چھوڑ کر میرے ساتھ چلی آ۔ میں بھکاری سہی لیکن تجھے مہارانی بنا سکتا ہوں۔ میں اپنی لڑکی کو مہارانی بنا رہا تھا، لیکن کمبخت مر گئی۔ ایک جاگیر دار اس کو مہارانی بنانے والا تھا۔ اب وہ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اب تو ہی میری بیٹی ہے۔ تو ہی اس کی مہارانی ہے۔ (16)

بوڑھے فقیر کا یہ بیان قحط بنگال کے دوران غریب لوگوں کے استحصال کو بیان کرتا ہے۔ جب امرا لڑکیوں کو خرید لیتے تھے اور والدین کو دیگر سہولیات وغیرہ بھی مہیا کرتے تھے۔ امرا نے اس عمل کو اپنے تعیش کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ بوڑھا فقیر گرجا کی جوان لڑکی کو بھی اس معاملے میں آنے کی ترغیب دیتا ہے۔ واحد متکلم بوڑھے فقیر کو دیکھتا رہتا اور اسے پتہ ہوتا کہ وہ بھوکا ہے لیکن وہ اس کی مطلق دیکھ بھال اور مدد نہ کرتا۔ متکلم سوچتا کہ بے کار لوگوں کو مر جانا چاہیے۔ بوڑھا مانگنے کا بہت شوقین ہے وہ ایسے نوعمر بھکاریوں کو ترجیح دیتا ہے جو گداگری کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں بذریعہ متکلم ابراہیم جلیس اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ سماجی طاقتیں لوگوں کو بھکاری بنتا دیکھ کر پر مسرت ہوتی ہیں۔ ابراہیم جلیس نے اس افسانے میں بالواسطہ طور پر قحط بنگال کے عصری سانحہ میں جنم لینے والی بہت بری صورت حال اور ابتر معاشی حالات کو بیان کیا ہے، بڑھتی ہوئی غربت نے بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

دیوندر ستیارتھی کے قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے حوالے سے اہم افسانوں میں ”پھر وہی کنج قفس“، ”نئے دھان سے پہلے“ اور ”قبروں کے بیچوں بیچ“ شامل ہیں۔ افسانہ ”پھر وہی کنج قفس“ میں ایک قافلے کا حال بیان کیا گیا ہے جو قحط بنگال کے دوران واپس اپنے گاؤں مانگاماٹی اور شوپور جا رہا ہے۔ ایک بیراگی بابا مڑ مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ راستے میں وشنوپور والے بچھڑ جائیں گیاور رانگاماٹی والے بھی قافلے کو آخری سلام کر جائیں گے۔ بیراگی بابا کے ساتھ اس کا نواسہ ہے۔ راستے میں کئی لوگ ہمت ہارتے جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ وہ قافلے کا ساتھ چھوڑ دیں۔ قحط بنگال کی بربادی کا منظر یوں بیان ہوتا ہے:

> ہم نے چلا چلا کر ہر ساتھی سے کہا کہ اب گاؤں چلنا چاہیے۔ جنم بھومی بلا رہی ہے اور نوجوان سوچ رہے تھے کہ کلکتہ کی سڑکوں پر تو موت پہلے ہی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ بہت سوں کی تو لاشیں بھی دکھائی نہ دیں۔ (17)

سب قافلے والے اس بات پر پر امید ہیں کہ اب گاؤں میں دھان ہی دھان ہو گا۔ ان مسافروں میں دو بھائی دادا اور گنیش بھی شامل ہیں۔ چھوٹا بھائی گنیش اس بات کا پختہ ارادہ کر چکا ہے کہ وہ اب کبھی کلکتہ نہیں جائے گا۔ ان کے ساتھ نئے مسافروں میں ٹھاکر ماما بھی شامل ہے جو سوچتا ہے کہ جنم بھومی سورگ سے بھی انمول ہے وہ کسی اور ماں کو نہیں جانتے جنم بھومی ہی ماں ہے۔ اس کا سوچنا تھا کہ کلکتہ میں اب اونچے

اونچے مکان بن گئے ہیں اور کوئی "ماں" کو نہیں پہچانتا۔ ٹھاکر ماما کی یہ سوچ قحط بنگال میں جنم لینے والی اس بے حسی کو بیان کرتی ہے کہ جب ہر آدمی خود غرضی کا شکار ہو گیا تھا، وہ لوگ قحط سے ستائے ہوئے کلکتہ گئے لیکن وہاں ان کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اسی بنا پر انہیں واپس اپنے گاؤں کی جانب لوٹنا پڑا۔ اسی قافلے میں دو لڑکیاں پدما اور آرسی بھی شامل ہیں جو اس بات پر پر امید ہیں کہ اب کبھی کال نہیں پڑے گا۔ قافلے والوں کی یہ گفتگو ایک طرف قحط بنگال کے باعث کلکتہ کے برے حالات کی عکاسی کرتی ہے اور دوسرا ان کی اپنی جنم بھومی سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کا سوچنا ہے کہ رانگاماٹی تمام دکھوں کا حل ہے سب بیماریوں کا تریاق ہے، وہاں سب سکھ پائیں گے۔ گنیش اور دادا رانگاماٹی میں موجود زمیندار ساہو کار کی باتیں کرتے ہیں، کہ اب پھر ساہو کار قرضہ دے گا لیکن ساتھ بھاری سود بھی عائد کرے گا۔

کلکتے میں غربت کے عروج پر پہنچ جانے کا ذکر ملتا ہے تو دیہاتوں میں ساہو کاری نظام کے ظلم کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ستیار تھی یہ بتاتے ہیں کہ کیسے ساہو کاری نظام پورے خطے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ سود در سود کا نظام ایک بہت بڑا معاشی المیہ ہے، جس نے قحط بنگال کے دوران مزید زور پکڑا۔ اس افسانے میں دیوندر ستیار تھی نے قحط بنگال کے عصری سانحہ کو کمال مہارت سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس رنج کا اظہار بھی کیا ہے کہ غریب لوگوں کی بھی کیا زندگی ہے وہ اپنا مستقبل بہتر نہیں بنا سکتے وہ اسے بہتر بنانے کا حق نہیں رکھتے۔ انہیں واپس اسی استحصالی نظام میں آنا پڑتا ہے جس نظام کے وہ پہلے ہی ڈسے ہوئے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ رانگاماٹی جو سکھوں کی سرزمین ہے جو آتشی اور نعمتوں کا گہوارہ ہے وہ پھر استحصال کی زد میں ہے، اس افسانے میں دیوندر ستیار تھی نے کچھ گیت بھی شامل کیے ہیں جو ان کی تخلیقی اقلیم کا حصہ ہیں۔ افسانے کا عنوان گہری معنویت کا حامل ہے "پھر وہی کنج قفس" رانگاماٹی کے باسی پھر اسی سود اور ساہو کاری کلچر کا حصہ بننے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں، انہیں پھر سے اس استحصالی کلچر کے قفس میں قید کر دیا جاتا ہے۔

ستیار تھی کے فن افسانہ نگاری کے بارے میں کنہیالال کپور رقم طراز ہیں:

> ستیار تھی کے افسانوں میں حیرت انگیز تنوع ہے۔ عام افسانہ نگاروں کی طرح وہ ایک پلاٹ کا بار بار اعادہ نہیں کرتا۔ وہ تمام مسائل اور موضوعات، جن سے زندگی کی فراوانی قائم ہے، اس کے افسانوں کے پلاٹ زندگی کے ہر پہلو سے ہم آہنگ ہو کر وہ نئے نغمے اور تانیں تلاش کر لیتا ہے۔(18)

دیوندر ستیار تھی کا افسانہ "نئے دھان سے پہلے" بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے حوالے سے ہے۔ اس افسانے کے آغاز ہی سے قحط بنگال کے انسانی المیے کا بیان ملتا ہے۔ قحط کے مارے ہوئے بھوکے ننگے لوگ لنگر وصول کرنے کے لیے قطار میں کھڑے ہیں:

> یہ کنگلوں کی قطار تھی۔ ہو نہ ہو کمان کی طرح۔ ایک ساتھ کہیں سات آدمی کھڑے تھے تو کہیں دس، عورتیں اور بچے اور مرد جوان اور بوڑھے۔۔۔ سبھی ایک ترازو میں تل رہے تھے۔ سبھی بھوکے تھے۔

> ننھے بچے سوکھی چھاتیوں کو چچوڑ رہے تھے۔ بڑی عمر کے بچے قطار سے نکل کر لنگر کے دروازے پر پہنچنے کے لیے ضد کر رہے تھے۔ لنگر والوں نے لاکھ جتن کیا کہ عورتوں اور مردوں کی الگ الگ قطاریں بن جائیں، پر یہ بھاری بھرکم کمان، اپنی جگہ پر ڈٹی رہی۔ (19)

قطار میں کھڑے کھڑے افسانے کی مرکزی کردار جے شری سوچتی ہے کہ ستیہ یگ نہ جانے کب آئے گا۔ وہ بچپن سے سنتی آئی ہے کہ دنیا کی نیا پاپ سے بھر چکی ہے۔ اب ڈوبی کہ ڈوبی۔ اس کے دل میں ان گنت گدھ منڈلانے لگے، یہ سب گدھ اس پر جھپٹنے کی کوشش میں تھے۔ اس نے سوچا ستیہ یگ اب آئے یا نہ آئے یہ گدھ تو ہم کنگلوں کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ اس کا بیٹا راکھال بار بار زور لگا رہا تھا لیکن ماں کی انگلی چھڑا کر بھاگ نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ اس کے جسم میں اب اتنی سکت نہ تھی۔ بھوک کی وجہ سے اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ جے شری سوچ رہی تھی کہ اگر راکھال کا باپ زندہ ہوتا تو وہ محنت مزدوری کر کے اس کے لیے خوراک کا بندوبست کرتا۔ انہیں اس قدر مجبور ہو کر دال بھات کے لیے قطاروں میں نہ لگنا پڑتا۔

دال بھات حاصل کرنے والی قطار میں کھڑے ہوئے لوگ اس اکال پر پریشان تھے اور ساتھ ہی ساتھ حیران بھی تھے کہ اس سال تو اتنا اچھا غلہ ہوا تھا وہ کہاں گیا؟ برطانوی حکومت کی بدنیتی اور عدم توجہی کی وجہ سے اس قحط نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ لوگوں کی زندگی بہت پریشان کن ہو گئی، ان کے عقائد بھی کمزور ہونے لگے۔ وہ بھگوان کی طرف سے ناامیدی کا شکار ہیں۔ قطار میں کھڑے کھڑے جے شری کو بہت مشکل سے لنگر ملتا ہے۔ راکھال اس لنگر پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کا پیٹ پھول چکا ہے وہ سوکھے کا مریض بن چکا ہے۔ لنگر کی تقسیم کے بعد جب وہ واپس جا رہی ہوتی ہے تو راستے میں راکھال کی طبعیت خراب ہو جاتی ہے۔ اس پر پانی پھینکا جاتا ہے لیکن وہ جانبر نہیں ہوتا۔ جے شری جو حاملہ تھی راکھال کی موت کے صدمے سے زمین پر گرتی ہے اور اس کی سانسوں کی ڈور بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

جے شری کا پورا خاندان قحط بنگال کی نذر ہو گیا۔ اس کی موت سے اس کے کٹھن سفر کا اختتام ہوا جس کا آغاز قحط بنگال سے ہوا تھا۔ یہ محض کسی ایک خاندان کا حال نہیں بلکہ قحط بنگال کے دوران ایسے ہزاروں خاندان تھے جو اجڑ گئے۔ دیوندر سیتار تھی نے اس انسانی المیے کی فکری، روحانی، مذہبی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی پرتوں کو کھولا ہے۔ اناج کی اس جانب دارانہ تقسیم پر خدا سے ایمان اٹھتا نظر آتا ہے۔ بھگوان سے بیزاری کا عنصر ملتا ہے۔ سماج زمینداروں، ساہو کاروں اور مہاجنوں کے قائم کردہ معاشی نظام نے عام لوگوں کی زندگی دوبھر کر دی ہے۔ سیتار تھی نے اس افسانے میں اس دوہرے اور استحصالی نظام کی بھی قلعی کھولی ہے۔ اس کے علاوہ قحط کے دوران لوگ کس قدر نفسیاتی کھنچاؤ کا شکار تھے۔ ان میں ذہنی کرب، یاسیت اور غصہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

عبدالسمیع اس افسانے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> نئے دھان سے پہلے'' میں بھوک کی شدت اور قحط سے پیدا ہونے والے مسائل کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قحط کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، کھیت گروی رکھنا اور گھروں کے اثاثے بیچ دینا اور معلوم ہوتا ہے پیٹ کے لیے انسان کی حیوانیت جاگ اٹھتی ہے، وہ اپنی ماں اور بہنوں کا سودا کرنے لگتا ہے، یہ تمام زاویے سیتار تھی نے نئے دھان سے پہلے میں ایک وحدت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔(20)

دیوندر سیتار تھی کے افسانہ ''قبروں کے بیچوں بیچ'' میں بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کے آغاز میں ہی ستیار تھی نے قحط بنگال کی تباہ کاریوں کی جانب اشارہ کیا ہے:

> دس لاکھ بھوک موتیں، پندرہ لاکھ، انیس لاکھ اور اسی ہفتے کل چوبیس لاکھ اور ابھی تک اس بھیانک در بھکشا کا زور بڑھ رہا تھا۔(21)

اس افسانے میں گیتا ایک لوری گا رہی ہے جس کا افسانے اور قحط بنگال کے سانحہ کے ساتھ گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔ ''بچہ سو گیا۔ محلہ شانت ہو گیا۔ دیش میں ورگی آ گئے بلیوں نے دھان کھالیا۔ اب لگان کیسے دیں گے''۔ بنگال کے لوگوں کی اذیت کا ذمہ دار بھی انگریز سامراج تھا جو بلوں کی طرح ان کی فصل کھا رہا تھا اور ٹیکسوں سے انہیں نوچ رہا تھا۔ اس افسانے میں سات ساتھیوں کا قافلہ ہے جو کلکتہ اور بنگال کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے جا رہے ہیں۔ اس قافلے میں گیتا، جعفری، امجد، علی اختر، بھوشن، پراشر اور کپور شامل ہیں۔ گیتا کچھ دیر کے لیے آرام کرتی ہے وہ سوچتی ہے کہ اگر بنگال کے اناج چور اس کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ ان کی خوب درگت بنائے۔ جنہوں نے بنگال کے چھ کروڑ لوگوں کا گلا گھوٹنے کی کوشش کی۔ اس افسانے کے مختلف کردار آپس میں قحط بنگال کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ جس سے بنگال کے حالات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں کہ کیسے لوگ بھوک کی وجہ سے مر رہے ہیں اور عورتوں کی عزتیں بیچ بازار نیلام کی جا رہی ہیں۔

قحط بنگال کے دوران غربت و افلاس زوروں پر تھی اخلاقیات کا بھی جنازہ نکل چکا تھا۔ مفاد پرست جس بھی شعبے سے منسلک تھے انسانوں کی اس کمزوری کا متواتر فائدہ اٹھانے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ساتوں دوست ایک مقام سے گزرے جہاں ایک بڑھیا قبرستان میں بیٹھی ہوئی تھی وہ اپنے بیٹوں کی وفات پر پاگل ہو چکی تھی۔ قبرستان میں قبروں کی جگہ کم پڑ گئی اس لیے کافی لاشوں کو دریا میں بھی بہانا پڑا۔ قحط بنگال میں اس قدر ہلاکتیں ہوئیں کہ میتوں کو دفنانے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ ساتوں دوست بڑھیا کے اس غم پر بہت افسردہ تھے۔ ستیار تھی نے قحط بنگال کے انسانی المیے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس المیے میں معاشی المیہ بھی شدید نوعیت کا تھا جب والدین کو اپنی جوان بیٹیاں فروخت کرنا پڑیں۔ بھوک اور افلاس کی وجہ سے بنگال میں اس قدر اموات ہوئیں کہ ہر جگہ قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھی۔ زندگی کا سفر

قبروں کے بیچوں بیچ جاری تھا۔

صدیقہ بیگم کا افسانہ ”چاول کے دانے“ بھی قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے تناظر میں ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانہ کی ابتدائی سطور ہی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں:

> آج چھ دن ہو گئے، کھانے کو کچھ ملا نہیں ہائے اللہ کیا کرے۔ اتنے دن گھر بار بیچ باچ کر سب کھا گئے۔ پر اب تو کچھ نہیں جو کھائیں۔ ایک کھاٹ، دو بر تن، شفو اور منو دو ہیں۔ نذیر بھی جب سے گیا واپس نہیں آیا، یہ بچے بلکتے ہیں۔ میں کیا کروں تھوڑا سا بھی کھانے کو ہوتا تو میں خود نہ کھاتا انہیں کھلا دیتا۔(22)

افسانے کا مرکزی کردار ایک دادا ہے جو دکھی ہے کہ اس کے پوتے پوتی نے چھ دن سے کچھ نہیں کھایا، اس کا بیٹا نذیر کلکتہ گیا تھا وہ واپس نہیں آیا۔ دادا کے پاس بچوں کو کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی بہو بھی قحط سے مر گئی۔ بہت زیادہ تعداد میں لوگ مر رہے ہیں۔ فضلی بھیا ابھی کل ہی مرے آج ان کے دونوں بچے بھی مر گئے۔ وہ بار بار قحط سے پہلے کے وقت کو یاد کرتا ہے جب جیون خوشیوں سے بھرپور تھا۔ اب شفو بھوک سے مر رہی تھی اگلے مہینے اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دادا نے قحط بنگال میں امداد کرنے والوں سے درخواست کی کہ انہیں پیسوں کے بجائے چاول چاہیں۔ فاقوں سے بچنے کے لیے دادا نے شفو کو سیٹھ کے پاس چھوڑ آنے کا فیصلہ کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ مخمصے میں تھا:

> جوان لڑکی، سیٹھ کے گھر، پیسے والے ہیں، چاول والے ہیں، کھانے کو تو ملے گا، پر میری آبرو، کہنے والے کیا کہیں گے۔ کنبے والے رہ کہاں گئے ہیں، پر میں اپنے واسطے تھوڑا ہی کر رہا ہوں اس کا انتظام ہو جائے گا، پر آبرو بھی کوئی چیز ہے۔ نہیں وہ اپنی شفو کو مرنے نہیں دے گا۔(23)

صدیقہ بیگم نے کامیابی کے ساتھ دادا کی نفسیاتی کش مکش بیان کی ہے۔ ایک طرف اسے اپنی عزت اور غیرت کا معاملہ لگ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی جوان پوتی کو سیٹھ کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے بھوک سے مر جانے کا خوف بھی تھا۔ شدید سردی کی رات میں دادا اپنی پوتی شفو کے ہمراہ سیٹھ کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن سیٹھ شفو کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ سیٹھ کا بیٹا شفو کو خرید لیتا ہے۔ دادا ذہنی کش مکش کا شکار ہے ایک جانب وہ شفو کے بارے میں مطمئن ہے تو دوسری طرف پریشان بھی ہے:

> میری شفو کا توٹھکانہ ہو ہی گیا۔ پر میں نے ڈیڑھ پاؤ چاول پر اس کو بیچ دیا۔ ہائے اللہ نذیر سنے گا تو کیا کہے گا۔ میں نے اس کی لڑکی کو بیچ دیا۔ ڈیڑھ پاؤ چاول پر۔ ڈیڑھ پاؤ چاول معلوم نہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے۔(24)

بوڑھا اس سرد رات کو ڈیڑھ پاؤ چاول اپنے پھٹے دامن میں لیے جارہا تھا اس کے ذہن میں سینکڑوں سوالات گردش کر رہے تھے۔ اسے شدید فکر لاحق تھی کہ وہ اپنے بیٹے نذیر کو کیا جواب دے گا کہ اس کی بیٹی کو ڈیڑھ پاؤ چاول کے عوض بیچ دیا۔ پھر وہ چکرا کر گر گیا۔ چاول کے دانے اس کے دامن سے گر کر بکھر گئے اور چاندنی رات میں چاول کے دانے چمکنے لگے۔ صدیقہ بیگم نے اس افسانے میں قحط بنگال کے انسانی المیے کو پیش کیا ہے۔ ایک دادا اپنی پوتی کو ڈیڑھ پاؤ چاولوں کے عوض فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ قحط بنگال کے شکار لوگوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ حکومت نے ان کے رنج و تکلیف میں تخفیف کے لیے کوئی توجہ نہ دی۔ صدیقہ بیگم نے اس سارے سانحہ کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔

صدیقہ بیگم کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین رقم طراز ہیں:

> بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ صدیقہ بیگم کے افسانوں میں کبھی کبھی خشکی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ ان کا انداز بیان یا تکنیک اس کی ذمہ دار ہے یا خود موجودہ زندگی۔ ان کے افسانوں کا موضوع عموماً زندگی کی ابتری، سماج کی ستم ظریفی، حکومت کی بے راہ روی ہے۔ اس عالم میں زندگی خود اتنی بے کیف ہو گئی ہے کہ جیسے رنگینی زندگی سے کم ہو گئی ہے۔(25)

قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کے تناظر میں قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں ”غریب خانہ“ اور ”سب کا مالک“ اہمیت کے حامل ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کے تحریر کردہ ان افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد رقم طراز ہیں:

> قحط بنگال کی بدترین صورتوں کو شہاب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کیونکہ وہ ان دنوں نئے نئے آئی سی ایس ہوئے تھے اس طرح نے انہوں اس موضوع سے متعلق جو افسانے لکھے وہ محض اخباری رپورٹوں پر مبنی نہیں تھے بلکہ براہ راست تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ تھے۔ ’سب کا مالک‘ اور غریب خانہ اس موضوع سے متعلق دو افسانے ہیں جن میں بھوک اور محرومی کے ہاتھوں مسخ ہوتے انسانی جذبے اور رشتے ہی زیر بحث نہیں لائے گئے بلکہ سرکاری کارندوں کی بے حسی اور ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں سے ان کے غیر انسانی ملی بھگت کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔(26)

افسانہ ”غریب خانہ“ میں قحط بنگال کے بعد بنگالی خواتین کو پیش آنے والے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں قدرت اللہ شہاب نے قحط بنگال کی ستائی ہوئی عورتوں کے ساتھ غریب خانے میں ہونے والے سلوک کو بیان کیا ہے۔ ان عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا یہاں انہیں کھانے پینے کو تو کچھ مل رہا تھا لیکن انہیں جنسی استحصال کا سامنا تھا۔ ان کے نام پر آنے والے راشن کو بھی غریب خانہ والے خود کھا جاتے تھے اور انہیں گندے برتنوں میں کھلایا جاتا۔ بنگال کے مختلف قحط زدہ علاقوں سے عورتوں اور بچوں کو غریب خانے لایا

جاتا۔ غریب خانے میں انہیں چھت اور تھوڑا بہت کھانا میسر آجاتا وہ اسی بات پر ہی مطمئن ہو جاتے۔ اس افسانے میں قدرت اللہ شہاب نے استحصال کرنے والوں کی ایک پوری زنجیر کو بیان کیا ہے۔ برطانوی راج کی بد دیانتی اور بد نیتی کی وجہ سے بنگالیوں کو قحط کا سامنا تھا، اول تو انہیں کوئی امداد نہیں پہنچائی جا رہی تھی لیکن جو تھوڑی بہت امداد تھی بھی اس پر دوسرے لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہ مستحقین تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ حکومتی سطح پر انتظامی فقدان نے قحط بنگال کے انسانی المیے کو شدید تر بنا دیا۔

اس ضمن میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> یاخدا' کی طرح 'غریب خانہ' بھی قحط میں سرکاری کارندوں کے رویے کو بے نقاب کرتا ہے۔ جتنی بھی عورتیں جینے کے سہارے کی ڈور تھام کے غریب خانے پہنچتی ہیں، وہ دیکھتی ہیں کہ اس مہین ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک نہ ایک سرکاری کارندہ ننگے وحشی حیوان کے روپ میں کھڑا ہوتا ہے۔(27)

افسانہ ''سب کا مالک'' میں قدرت اللہ شہاب نے قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے کا آغاز ریتا کے رقص سے ہوتا ہے مالک اس کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ رضیہ ایک طرف طرف کھڑی ہو کر دیکھ رہی تھی۔ اس رات رضیہ کے ذہن میں سونے چاندی کے گھنگھرو ہی بجتے رہے۔ مالک کی تکان اتارنے کے لیے انہیں یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔ رضیہ کو رقص پر مجبور کیا جاتا۔ اگر وہ مالک کو خوش نہ کرتی تو اسے خدشہ تھا کہ رات کو اس کے بھیجے گئے غنڈے آکر ان کے گھر پر ٹوٹ پڑیں گے۔ رضیہ کے باپ نے بہت محنت سے دھان اگایا تھا۔ دھان کے دام آٹھ، دس، بیس، پچیس، تیس، پنتیس روپے من تک چلے گئے۔ لیکن کسانوں کے ذخیروں کی کنجیاں سیٹھ بھائی بالا بخش اور بجرنگ لال کے ہاتھ میں تھیں۔ بہت محنت سے لگائی گئی دھان پانچ روپے من کے اعتبار سے اٹھائی جانے لگی کچھ اصل زر میں کٹ گیا کچھ سود میں نکل گیا۔ پھر ہنستے کھیلتے بچے کمزور ہونے لگے۔ ان کے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بننے لگے۔ ان کی پسلیاں چر چر کرنے لگیں۔ ان کے پیٹ پھولنے لگے عورتوں کی چھاتیاں سوکھ سوکھ کر ڈھلکنے لگیں۔ قدرت اللہ شہاب نے اس افسانے میں قحط بنگال کے ذمہ دار مہاجنوں اور سیٹھوں کے ظلم کو بیان کیا ہے۔ ایسے سیٹھ کس طرح عام لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ ان کی فصل اونے پونے داموں خرید لیتے اور منافع پر آگے بیچ دیتے۔ اس معاشی استحصال نے بنگالیوں کو قحط میں مبتلا کر دیا۔

قحط بنگال کے عصری قدرتی سانحہ پر اختر اورنیوی کا افسانہ ''جنگل'' اور میرزا ادیب کا افسانہ ''کنگال دیس میں'' بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے قحط کے دوران عوام کے کرب اور دکھ کو بیان کیا ہے۔ جو بلاشبہ ایک بڑا انسانی المیہ تھا۔ قحط بنگال کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں قحط کی وجہ سے برپا ہونے والی کربناک صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ جب ہر طرف موت کا راج تھا، لوگوں کی حالت تکلیف دہ تھی، عورتوں کی جسم فروشی اور خرید و فروخت کا دھندا زوروں پر تھا۔

حوالہ جات

1. https://www.independent.co.uk/news/people/winston-churchill-accusations-anti-semitism-blunt-refusal-led-deaths-millions retrieved on 02-02-2021
" I hate Indians, they are beastly people with a beastly religion, famine is result of their own fault for breeding like rabbits."

2۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2010)، ص327

3۔ زاہدہ حنا، ”انسانیت کا ادیب“، ارتقا (کرشن چندر نمبر) 59 (کراچی: دسمبر 2014): ص129

4۔ شہزاد منظر، ”کرشن چندر ایک عہد کا نام“، ارتقا، ایضاً، ص98

5۔ کرشن چند۔ کرشن چندر کی بیس کہانیاں، مرتبہ شکیل حسین سید (ملتان: بیکن بکس، 2014)، ص265

6۔ ایضاً، ص264

7۔ پروفیسر سید احتشام حسین، ”کرشن چندر کی افسانہ نگاری“، ارتقا (کرشن چندر نمبر) 59 (کراچی: دسمبر 2014): ص17

8۔ کرشن چندر۔ کرشن چندر کی بیس کہانیاں، مرتبہ شکیل حسین سید، ص279

9۔ ابراہیم جلیس، زرد چہرے (حیدر آباد دکن: اردو محل، جنوری 1945)، ص114۔115

10۔ ایضاً، ص39

11۔ ایضاً، ص47

12۔ ایضاً، ص49۔50

13۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ (کراچی: منظر پبلی کیشنز، 1982)، ص275

14۔ ابراہیم جلیس، زرد چہرے، ص23۔24

15۔ ایضاً، ص127

16۔ ایضاً، ص128

17۔ دیو ندر ستیارتھی۔ شہر شہر آوارگی، دیوندر ستیارتھی کی کہانیاں (حصہ اول)، مرتبہ عبدالسمیع (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز 2012)، ص129۔130

18۔ دیوندر ستیارتھی، اور بنسری بجتی رہی (لاہور: انڈین اکیڈمی، 1946)، ص7۔8

19۔ دیوندر ستیارتھی۔ شہر شہر آوارگی، دیوندر سیتارتھی کی کہانیاں، مرتبہ عبدالسمیع، ص505

20۔ ایضاً، ص80

21۔ ایضاً، ص521

22۔ صدیقہ بیگم، ہچکیاں (الہ آباد: پربھارت پبلشرز، دوسرا ایڈیشن 1950)، ص49

23۔ ایضاً، ص63

24۔ ایضاً، ص68

25۔ ایضاً، ص15

26۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2010)، ص137

27۔ ایضاً، ص137